

وہ دیکھتا رہتا، سوچتا رہتا اور پھر اس جگہ کا رعب اس پر طاری ہوتا چلا جاتا۔  
«پار سر نیدر لے!» وہ چلتے چلتے یورن ہی سوال کر دیتا۔ «ٹلکر لندن کیسے پہنچ گا؟ یعنی میں

ٹو سمندر ہے۔»  
استاد اسٹلر کے پاس ایسا بڑا وہ ہے کہ سمندر میں پھر ک دو قوہ شانت ہو جائے کے  
اور پھر سماں بن جائے۔»

پھر واپس کالج میں جہاں بحوم تھا، شور تھا، سر نیدر نہ ہوتا تو وہ لڑکوں کے اس بحوم  
میں کھو جاتا۔ مگر پھر وہ پورا، بحوم کھو گیا۔ صدر سر نیدر کے رکنی لڑکے نے برآمد سے سے گزرتے  
گزرتے نعرہ لگایا:

«ہندوستان چھوڑ دو۔»

کلا سوں میں جاتے، کلا سوں سے نکلتے لڑکے ٹھکے۔ پھر ایک دم سے نعروں کا طوفان اُٹھ  
کھڑا ہوا۔

«ہندوستان چھوڑ دو۔—قلاب زندہ یاد۔—ہمارا گاندھی کی جے،»  
پھر کلا سوں کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ پھر کسی نے چڑا کیا،  
«وہ آکر ہے ہیں۔»

بھگدڑ، خالی ہوتے برآمد سے استاٹا، استاٹے میں دور سے آتی ہوئی گھوڑوں کی ٹاپوں کی  
آواز۔ کالج میں گھر سوار پولیس آرے ہی تھی۔

برآمد سے، کمر سے، بہرہ زار، ہفتون، ہیجنوں سنسان پڑے رہے۔ جہاں تھاں میٹھے  
ہوتے لٹھ بڑا ریساہی کبھی اوٹھتے ہوئے، کبھی مستعدی سے کھڑے ہوئے میٹھی بھر سلمان  
لڑکے، پاپخ سافت ایک کلاس میں توڑھاتی تین دوسری کلاس میں۔ مگر پرو فیسٹر کمی ایس بھی  
اتنی ہی گرجوشنی سے اور اتنی ہی آواز میں یک پھر دیتے جیسے کچھ تھیں ہوا ہے۔

اتھانوں کے آتے آتے لڑکے والیں آتے مگر کہاگھی والیں نہیں آئی۔ پھر جھٹیاں

اگلیں۔ واپس پھر ویساں پور میں موسم اب کتنا بدل گیا تھا۔ بدلتے بدلتے اتنا بدلا کر لوئیں چلنے لگیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے گھر فل کے دروازے بند ہو جاتے، پیٹھکوں میں ٹکڑی خش کی ٹیڈیاں پانی میں تربیز نظر آتیں۔ مگر پنچالی گلیاں دھوپ سے ناآشتا تھیں۔ ان گلیوں میں کتنے گھر تھے کہ خش کی ٹپٹی سے یہ تیاز تھے۔ قریب ڈھیوں میں عورتیں چڑھ کرتی، بائیں کرتی نظر آتیں۔

”تو نے دیکھا؟“ سر نیدر نے پھر والی گلی سے جلدی چل رہی تکلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں یا راجھے تو کوئی دھکتا نہیں دیا۔“

”چوبارے میں جو کھڑی بھتی اُسے نہیں دیکھا؟“

”نہیں، کون کھڑی بھتی؟“

”رم جھم اور کون۔“

”رم جھم۔“

”ہاں، میں اُسے رم جھم کہتا ہوں۔ میں تو اُسے دیکھے گا تو سلے ہلاک ہو جائے گا۔“  
ایک پھیرا، دوسرا پھیرا، تیسرا پھیرا، پھر نظر ہی نہیں آتی۔ ”یار وہ تو فاسد ہو گئی۔“  
سر نیدر بالوں سہیں ہوا تھا۔ بندروں لے کو دیکھ کر کھل اٹھا۔ ”یار سن! اس کے ساتھ چلتے ہیں۔“

بندروں والا کھڑی دوپہری میں ٹکڑی بھتی بجا تا ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسرا گلی میں۔ آخر کو پھر والی گلی میں تماشا شروع کیا۔ بندر یا نہیں مانی تو بندرتے اُسے ڈنڈے سے پیٹیا، اتنا کر روتھکر میسکے چل گئی۔

سر نیدر کی نظر میں چوبارے پڑھی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بندر کا تماشا دیکھنے ضرور آئے گی۔

”ابے سلے دیکھ۔“

”کہاں؟“

”بچو بار سے میں، وہ کھڑی ہے۔“

اس نے دیکھا۔ سانوں زنگت، دبلا دبلا نرم سرم یدن۔

”داری ماں مسلا۔“ ایک دم سے بھڑکی اور غائب۔

بھروہ اُسے نظر نہیں آئی۔ نہ آئے۔ سر نیدرنے اسے یہ تو سکھا ہی دیا تھا کہ لڑکی کو کیسے دیکھتے ہیں۔

بھروہ روپ نگہ چلا گیا۔ اسے ان چھٹیوں میں خالہ جان سے ملتے روپ نگہ بھی توجہ انھا کلتے بر سوں کے بعد وہ روپ نگہ کو پھر دیکھ رہا تھا۔ گلے ہے پڑی سڑک اُسی طرح گردیں ائی، اُسی طرح جہاں پڑے ہوتے دور ویہ سنگروں کے ڈھیر اُسی طرح اسکے اوپنے نیچے راستوں پر چکولے کھاتے ہوئے اور اُسی طرح بیل گاڑیاں پکے رستوں پر ریکٹی ہوئی۔ یہ تو سب کچھ اُسی طرح ہے۔ ایک اٹھیناں بھری چیرت کے ساتھ اس نے ایک ایک پیزیر کو دیکھا۔ نگہ سب کچھ اُسی طرح نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والے سب کے سب کے لکھنے بلبھے ہو گئے تھے۔ ان کے چڑوں کی زنگت پک گئی تھی، آفاؤں میں بھاری پن آگیا تھا۔ جیسی بیڑک پاس کمر کے ملی گڑھ چلا گیا تھا اور اب چھٹیوں میں والپس آیا تھا تو اس کی سچ دھج ہی اور تھی۔ پانچھا می کاٹ بدل گیا تھا۔ کہاں اس کے سر پر اُسترس کے بعد آم کی گھٹلی رکٹی جاتی تھی۔ اور کہاں اب اس کے بلبھے بلبھے انگریزی بال تھے۔ بندوں کو بھی شریف بنوئے تاولوں کا کام سکھنے کے لئے علی گڑھ بھجوادیا تھا۔

اور صابرہ اصابرہ اب کتنی بھی ہو گئی تھی اور سیمنہ اُس کا لکھنا ابھر آیا تھا کہ پہنچنے سے دو پڑے سے ڈھکے رکھتی۔ پھر بھی گول گول ابھار چھکلتے ڈھکاتی دیتے۔ اس سے تو وہ اب آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی، جیسے وہ اجنی ہو۔

لگی گئی، بازار پازار گھوما، گھومتا رہا۔ ایک پیلائے کی طرح کلتے دنوں کے بعد وہ اس انوس منظر سے سیراب ہوا تھا۔ کس پیٹے تابی کے ساتھ چیزوں کو دیکھ رہا تھا، پیٹے تابی

کے ساتھ اور ہوس کے ساتھ جیسے سب کچھ نظر کی راہ اندر سمیٹ لینا چاہتا ہو۔ چیزیں کبھی اُسی طرح نظر آتیں، کبھی بدلی میں بھلی کے کمپنے کتنے زیادہ ہو گئے تھے اور بھلی کے تار کتنے پھیل گئے تھے کہ چھوٹی بیڑیا کے سوا بھی پھیلنے نظر آتے تھے۔ یہ در تاروں سے پچ کمرہ ایک کوٹھ سے دوسرے کوٹھ پر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ روپ نگر کے بندروں نے بھلی کے زمانے میں جینا سمجھ لیا تھا۔

کامے مندر سے کہ بلا تک کہ بلا سے قلعہ تھا، قلعہ سے راؤں بن کے سب کچھ اُسی طرح تھا۔ دیزنک وہاں گھوماناں منظر میں استثنان کیا، پہ پوری آسودگی نہیں ملی۔ جیسے وہ پڑا اسراہیت جو ہیاں رچی بھی تھی، رخصت ہو گئی ہو۔ دور کھڑے ہو کر کامے مندر کو اس کے پڑے پیل کو اور اس موٹے بندر کو ہو سب سے اوپر والی ٹھنپ پر بیٹھا تھا، اگلے پچھلے ٹوپ کے تجربوں کو دھیان میں لاتے ہوتے دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں کوئی تحریر پیدا نہ ہو سکا۔ نہ تحریر نہ خوف۔ سب کچھ اُسی طرح تھا۔ مگر شاید وہ بدلت کیا تھا یا شاید اس کا وہ رشتہ برقرار نہیں رہا تھا۔ کامے مندر سے بڑے پیل سے، پیل کے بندروں سے، کہ بلا کی خاموش فضیل سے، راؤں بن سے، اس کے بیچ کھڑے پر ڈھنے سے ماشاید صایرہ سے بھی۔

نا آسودہ، نا مطمئن، تھکا تھکا والپس گھر آیا۔ کہہ می بہت تھی۔ تو لیا بیا اور دوپر کی دھوپ میں تینتھے صحن کو عبور کر کے غسل خانے کی طرف چلا۔ غسل خانہ اب بھی اُسی پرانے انداز پر تھا کہ اندر یا ہر نہ کنڈی نہ چھٹی۔ اٹکل رہتی تھی کہ کوئی اندر ہے یا نہیں ہے۔ شاید اب اسے دیکھ لئے رہی تھی کہ غسل خانے کے کواٹھوںے اور پوری طرح کھونتے سے پہلے بند کر دیتے۔ آنکھوں میں بھلی سی کونڈگئی۔

دیزنک بھلی ایسے اس لمحے میں کھویا کھویا رہا۔ یہ سوچ کر ہیڑان ہوا کہ طاہرہ باجی تو بالکل عورت ہیں۔ اس دن تو ان سے آنکھ ہی نہ ملا سکا۔ دوسرے دن آنکھ پچا کر ان کا سرہ سے پیڑنک جائی رہ لیا۔ وہ پنڈا گورا گورا بھر بھر اس کے تصور میں اُبھر آیا۔ اپنی تمام

تفضیلات کے ساتھ بشرط سے اُس کامنہ لال پوچھیا۔ اپنے آپ پر اس نے دل ہی دل میں کتنی ملاٹ کی۔ مگر طاہرہ باجی کو سرے سے کوئی احساس بھی نہیں تھا۔ اس سے تیرکھنی سے باقیں کیں۔ اور کالج کی ایک ایک بات پوچھی۔

”در ذاکرِ امتحارے کالج کی لاہوری میں راشد الخیری کی شامِ زندگی، ہے؟“

”بھی ہے۔“

”ہاتے اللہ! ذاکر اب کے آ تو شامِ زندگی، مزدورے کے آتا۔“

ناولوں کا ذکر ہوتے دیکھ کر صابرہ بھی جھگتی جھگتی آتی اور طاہرہ باجی کے ساتھ سبھ کہ بیٹھ گئی۔ ناولوں کا ذکر کرنے شوق سے سن رہی تھی۔ باویجی خانے سے خارج ان کی آوازاً۔

”در اری طاہرہ پہنڈیا تو دیکھے کہیں جل تھا جانتے۔ میں آٹا گونڈھ رہی ہوں۔“

طاہرہ باجی کے پلے جانے پر صابرہ پٹٹا سی گئی مگر اُنھوں کے جا بھی نہیں سکی۔ وہ خود بھی

بھینپا بھینپا بیٹھا رہا۔

رفتہ رفتہ حوصلہ پکڑا۔

”صابرہ! تم نے فردوس بیٹھا پڑھی ہے؟“

”د نہیں، لیکیسا ناول ہے؟“

اس نے فوراً ہی ”فردوس بیٹھا“ کا قصہ مستانا شروع کر دیا۔ پورا قصہ شاٹا۔

”ذکرِ ایمیں فردوس بیٹھا، لا دو گے؟“

”ہاں جب آؤں گا تو میں کے آؤں گا۔“

”اب اتم کب آؤ گے؟“

”بریٹے دن کی چھٹیوں پر،“

اس نے شتر کے اور کئی ناولوں کے قصے بھی سناتے۔ منع ان تفضیلات کے بھیں بیان کرتے ہوتے کچھ وہ جھگتی، کچھ وہ بھینپ جاتی۔ مگر صابرہ اب اس کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔

گھر کے کام کا جس سے تو اُس کا جی کچھ اچھا سا پہنچیا تھا۔ ادھر خالہ جان اور طاہرہ باجی گھر کے کاموں میں بھتی رہتیں، ادھر وہ اس کی باتیں سنتی رہتی، اس سے باتیں کہتی رہتی۔ باتیں کبھی نور زور سے، کبھی دھیر سے چھر سے، کبھی آنے دھیر سے کہ باتیں سروشیاں بن جاتیں اور صایہ کے چہر سے پہ سرخی دوڑ جاتی۔ اور جب اُس نے بُندوں کی تعریف کے بھلنے اس کے نکان کی لوگوں پہنچا تھا۔ تو اس کا سانس ایک دم سے کتنا گرم ہو گیا اور کتنا یز چلنے لگتا تھا۔ لکنی نہ م اور گرم بھتی وہ لوکہ ایک نرم گرم روپ پرلوں کی راہ اس کے اندر سراہیت کہتی چلی گئی۔

لکنی جلدی چٹپیاں ختم ہو گئیں۔ روپ بگرا سے پکڑ رہا تھا لگدا سے آخر کالج پہنچنا تھا۔ اور اس سے پہلے ویاس پور جا کر اسی جان کو صورت بھی دکھانی تھی۔

”اے تو آگیا؟ تو تو ایک ہفتے کا کہ کے گیا تھا اور اتنے دن لگا دیتے۔“

سریندر کی بات کے جواب میں اس نے پہلے کوئی ادھر کی بات کی کوئی ادھر کی لگ راز کو وہ لکنی دیر پچھا کر رکھ سکتا تھا۔

”پھر تو نے کیا کیا؟“

”میں نے کیا کیا؟ کیا کرتا؟ کچھ نہیں۔“

”بھجوٹا۔“

”سچ، اس سے آگے کوئی بات نہیں ہوتی۔“

”تو بہت گھاٹ ہے۔“ سریندر نے ملامت کی اور چیپ ہو گیا۔

پھر وہ آپ ہی آپ بولا:

”یار اُس کے ہاتھ بہت نرم تھے۔“

سریندر کی پیڑا ری دوڑ ہو گئی۔

”اچھا؟“

”ہاں“ چپ ہوا، خیالوں میں خوط کھایا، پھر بہت آہستہ سے بولا۔ ”اور ہونٹ بھی؟“  
”ہونٹ؟“ سرپنڈ کی انکھیں جیت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پھر وہ کھلتا چلا گیا۔ جو یہاں پر بیان نہیں کر سکا تھا، وہ اس نے کافی پہنچ کر جب  
اطمینان سے دلوں بیٹھے، بیان کیا۔ جب سب کچھ بیان کر چکا تو جو بیان کہہ چکا تھا۔  
اسے پھر بیان کیا، اور پھر بیان کیا۔ ہر مرتبہ یوں بیان کیا جیسے پہلی مرتبہ بیان کہہ رہا ہے۔

”اسچھا اب تو کب جا رہا ہے؟“

”کہ سمس کی چھٹیوں میں۔“

”وہ تو ابھی دور ہیں۔“

”ہاں یادا وہ تو بھی دوسروں میں۔“

”خط و ط لکھا اُسے۔“

”خط، ہاں یار خط لکھنا چاہئے،“ اور خط لکھنے کا سودا دلوں ہفتلوں سر پر سوار رہا۔  
روز قلم کاغذ کے کہہ لیٹھنا، کچھ لکھنا، پھر مھاڑ دینا۔

”یار لکھا کیا جاتے؟“

”جو لکھتا چاہئے۔“

”مگر یا اگر کسی اور نے خط پڑھ لیا تو؟“

”تو چ۔“

سرپنڈ سوچ میں پڑ گیا۔

”اُس نے بچھ سے ناولوں کے لئے کہا تھا؟ بس تو یہ لکھ کر مجھے ناولوں کے نام یاد  
نہیں رہے۔“

”و بالکل صحیک۔“

پھر سمس کی چھٹیاں بھی آخر آہی گئیں اور اس نے راشد الخیری اور شربر کے ناول

الماریوں میں سے ٹول ٹول کر تکالے اور اپنے کارڈ پر جاری کرتے۔

”رباڑ تو روپ تنگ تو نہیں جارہا ہے؟“

”کیوں نہیں جاتا۔ جارہا ہوں۔ کل کالج بند ہوتے ہی تک جاؤ گا۔“

سرتیندر کا، پھر لولا:

”بیمارست جائے۔“

”کیوں؟“

”بیمار سفر نہیں ہے اور گھاٹیوں میں گھر بڑی خرس آ رہی ہیں۔“

وہ سوچ میں پڑا گیا۔

یار گھر بڑی تو یہاں بھی ہوتی نظر آ رہی ہے،“

”ہاں یہاں بھی کچھ گھر بڑی ہے کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

”پھر؟“

سرتیندر نے سوچا، پھر کہا:

”ویاس پور چلتے ہیں، دونوں مل کر۔“

ویاس پوزنکا سفر کا لے کو سوں کا سفر بن گیا۔ ہومسافر زیادہ نقل و حرکت کرتا، ہشکوک دکھانی دیتا۔ ویاس پور کا پیٹ فارم لکھنا خاموش تھا اور جب باہر آئے تو حیران رہ گئے۔

”یار یہاں تو کوئی تانگہ ہی نہیں ہے۔“

”پھر پیدل چلتے ہیں۔ آخر دس سو یخی تو پیدل جا رہے ہیں۔“

حقوڑی دور تک آگے اور تھپپے گاڑی سے اُڑتے ہوئے سافر پیدل چلتے نظر آئے۔

پھر یا ایک احساس ہوا کہ سڑک غالی ہے۔ دونوں سڑک غالی نظر آ رہی تھی جگت ٹکریز کہ اس را میں سی سو شور مقام تھا۔ بند تھا اور بالکل خاموش۔ اس کی پیشانی پر غالے دونوں جو ایک جنہیں اس کھڑا تھا اور جس پر کافی مورث مسکراتی رہتی تھی، وہ پنج سڑک پر گرا

پڑا تھا۔ کائن کی تصویر بیٹھ پکی تھی اور روز تک انہیں بھری پڑی تھیں۔  
”دیار غلطی ہو گئی ہے۔“ سرپندر نے آہستہ سے کہا۔

”آنہیں چاہئے تھا۔“

پھر خاموش چلنے لگے شام بھری ہوتی جا رہی تھی اور روز تک کوئی آدمی نہیں تھا۔  
بس انہیں ہی انہیں۔ اس نے خوف و حیرت سے ان بھری انٹلوں کو دیکھا، اتنی انہیں  
تھیں ویاس پور میں!

چلتے چلتے وہ میرٹھ دروانے پر آئے۔ آگے سیدھی راہ پر کھڑکی بازار تھا جنبد پڑا  
تھا اور یہ چڑغ تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جنبد وؤں کے مخلوں میں جان لکھتا تھا۔ برائی میں ایک گلی  
چل کر تھی جو مسلمانوں کے مخلوں میں جاتی تھی اس دروازے پر دونوں ٹھنکے، دونوں نے ایک  
دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا اور الگ الگ رستے پر چل پڑے۔

”ذاکر یعنی! اسے کچھ سناتو نے، باہر گولی چل رہی ہے۔“

”بھی،“ اُس نے بدقت جگل سے واپس ہوتے ہوتے اسی جان کو دیکھا جن کے چرسے پر  
ہوا تباہ اُٹر، ہی تھیں اور آواز میں سخت بھر اپٹھ تھی۔

وہ اُپٹھ کر کھڑکی تک سیکا۔ ایک بڑھوں کرہ بایہر نظر ڈالی۔ جلسہ کاہ درہم و بہم تھی،  
شامیانہ گمراہ پڑا تھا، قنایتیں کہیں بھری رہ گئی تھیں کہیں جھک گئی تھیں، شامیانے کے  
ایک کوئی سے دھوان اُپٹھ رہا تھا۔ بھنگڑ پڑھنگڑی ہوئی تھی۔ کچھ بھاگ رہے تھے، کچھ سر  
پھٹوں کر رہے تھے۔ اس نے کھڑکی بند کی اور واپس کیا۔ بڑھ رہا یا ”بکواس۔“

”اے ہے میں تو سوتے سے اچھل پڑھی۔ قیامت فتحی ہوئی تھی۔ پھر طباں میں سے آوازانی  
میرا دل دھک کرنے لگا۔ اب تک کہہ ہاں ہے۔ میں نے تیرے باپ کو آواز دی کہا جی میں  
نے کہا کہ سور ہے ہو یا جاگ رہے ہو؟ وہ بڑھ رہا تھا کہ یہ بد سخت کسی بجلے مالن کو سونے  
دیں گے؟ میں نے کہا کہ مجھے اپسالگئے ہے کہ گوئی چلی ہے۔ بڑھ رہا تھے کہ پکستان میں اب یہ ہو گا

میں نے کہا کہ کوئی بات ہو یہ تو بڑی طبقہ کے رہ جاتے ہیں۔ ذاکر کو جلا کے بتا دیں؟ ہے؟

”کسی نے فائزہ کردیا ہوگا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جلسوں میں آج گلہ بی ہوتا ہے؟“

”اسے میٹے! ایسے گولیاں جلیں تو کیا ہو گا؟“

”کچھ نہیں ہو گا۔ آپ جا کے اٹیتیان سے سویں۔“

”بچھے لیکن ناؤ سے گا، میں تواندھ سے ہل گئی ہوں۔ پاکستان پر اللہ رحم کرے!“

”اُسی کچھ نہیں ہوتا، آپ جا کے سویں۔“

اجی کو جیسے تیسے رخصت کر کے اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی کھول کر بامہ نظر ڈالی۔

مجموع منتشر ہو چکا تھا کہ ہوتے شایبلے کے ساتھ جلسہ گاہ خالی پڑی تھی اور سارے بلب اُسی طرح جل رہے تھے۔ شایبلے کے جن کو تھے پہلے بہت دھواں اُنھوں نے تھا۔  
اب وہاں دھویں کی صرف ایک لکیر سی اُنھوں نے تھی۔

جلتی روشنی میں اچھڑی پچھڑی خالی پڑی جلسہ گاہ کو دینک تکتا رہا۔ وہ ایک بیساکر کر کے آیا تھا اور اب اپنے زملے میں ساتھ لے رہا تھا۔

---

میتے اس کے اندر رات ٹوٹ کے بر سا تھا۔ یادوں کی بد لیالی ماہ کمال سے گھر کر آئی تھیں۔ آسمان اب دھلان دھلان اور نرم نرم تھا۔ کوئی گوئی بدلتی ایک آسودگی کے ساتھ پر ترقی رہ گئی تھی۔ کوئی اجلاسا پھر، کوئی نرم ہی مسکرا پڑ۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں کتنا مگن تھا۔ باہر کی دنیا اس کے لئے اپنا مفہوم ٹھوپکی تھی۔ ناشتے کی میز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اخبار کی سرخیوں پر بے تعلقات سی نظر فرمائی اور اسے ابا جان کی طرف سفر کا دیا۔ ابا جان ناشتہ پہلے ہی کرچکے تھے اور ارادو والا اخبار پڑھنے میں منہماں تھے۔

جب وہ میز پر آکے بیٹھا تو انہوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”رذا کہ! ابیا آج تمہیں کامیح نہیں جانا ہے؟“

”جانا تو ہے، آنکھ دیر سے کھلی۔“

”تو پھر جلدی ناشتہ کرو اور جاؤ۔“ یہ سکھتے کئے پھر اخبار پڑھنے میں منہماں ہو گئے۔ اس کی آنکھ آج بے شک دیر سے کھلی تھی، پھر بھی اسے کوئی محنت نہیں تھی۔ اطمینان سے ہنایا دھوپیا، اب اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔

امی آئیں، چاٹے دافی کو رکھ لگا کر دیکھا۔

”ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔“

”نہیں، ابھی ایسی ٹھنڈی نہیں ہوتی ہے، چلے گی۔“ اس نے چاٹے دافی

کو پانچوں انگلیوں اور ہاتھیلی سے محسوس کرتے ہوتے کہا۔

« یدیا بنا شستہ سویرے کر لیا کرو۔ آخر میں اکیلی دم ہوں۔ گھر کے سارے کام بھے  
ہی بنی طرف نے ہوتے ہیں۔ » پھر فڑاً ابا جان سے مخاطب ہوئیں:  
« اجی ٹھاکر کے لئے کیا لکھا ہے؟ »

« کوئی خاص خبر نہیں ہے۔ »

ابا جان کی طرف سے منہ موڑ کر انہوں نے پاس پڑا ہوا انگریزی کا اخبار اس  
کی طرف سر کایا:

« بنتے! انگریزی کے اخبار میں دیکھ۔ اس میں کچھ لکھا ہو گا؟ »

بے تعلقی سے پھر ایک نظر اخبار پڑا ای اور کہا:

« کوئی قابل ذکر خبر نہیں ہے۔ »

وہ اسے تو پھر بتوں کی خیریت کیسے معلوم ہو گی؟ وہاں سے تو کوئی خبر ہی نہیں  
آتی۔ »

« اس پر بھروسہ رکھو، ہی ابا جان نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

« ہاں اُسی پہ تو بھروسہ کیا تھا۔ »

انی جملہ بھٹنے لجھے میں بولیں،

و بھروسے ہی بھروسے میں یہ دن آیا۔ »

ابا جان نے ٹھوکر کے امی کو دیکھا اور سرزنش کی:

« ذاکر کی ماں یہ وھیا نی میں منہ سے نکلا ہوا کوئی ایک جملہ عمر پھر کی  
عبدادت پہ پانی پھیرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ »

ندرامت سے امی کا سر جھیکا گیا۔ چپ پہ گئیں۔ پھر انہوں نے اور ہی بات

شروع کر دی۔

”ابی تمہیں یاد ہے کہ میں نے اس وقت بتوں سے کیا کہا تھا؟“

”وکب کیا کہا تھا؟“

”جب تم پلے تھے۔۔۔“

”ذالکر کی مل اکب کی بات یاد کر رہی ہو، مجھے قریاد نہیں ہے کہ تم نے اس وقت کس سے کیا کہا تھا؟“

”ابی تمہیں یاد نہ ہو، مجھے تو اس وقت کی ایک ایک بات یاد ہے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے اس سطح تک کہا تھا کہ تم ادھر آجائو، اللہ مسیب الاستیاب ہے وہ تو ادھر آئے کے لئے تیار تھی مگر طاہرہ کے میان پر ایسی منک سوار ہوئی کہ وہ اسی درفت تخلی گیا۔ اس عزیب کو بھی بیٹی کی غاطر ادھر جانا پڑا۔۔۔“

”فَاكَہَ کی مل اجنب امیر علیہ السلام فرمایا کہ تے فتحے کہیں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فتح سے پہچانتا۔ تو ہمارے ارادے اس کی مرہن کے تابع ہیں جو اسے منظور ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔۔۔“

انی ایک دفعہ پھر چیپ ہو گئیں اور سر سمجھک گیا، جیسے انہوں نے رخاتے الہی کے سامنے سر جھوکا دیا ہو۔

اباجان اس کی طرف مخاطب ہوتے:

”تمہیں شاید آج کا لمحہ نہیں جانا۔۔۔“

”بس جا رہا ہوں،“ اس نے ایک عجلت کے ساتھ چلتے کے آخری گھونٹ لئے اور

اٹھ کھڑا ہوا۔

گھر سینگھ کر گئی کاموڑ مرستے مرستے نظر اکی دوکان پر رکا۔ آتے جلتے اس دوکان پر لہکنا اور سگنیریٹ خریدنا انس کا معمول تھا۔

”ذالکر میان آج تو ہست گڑ بڑا ہے۔۔۔ سگنیریٹ، کامکڈی، دینے دینے نظر انے

مکھڑا لگایا۔

”کل گڈ بڑت نہیں بھتی؟“

”مگر آج بہت گڈ بڑت ہے۔“

آج واقعی بہت گڈ بڑت بھتی۔ کالج پہنچا تو دیکھا کہ مگدے جا بجا ڈٹے پڑتے ہیں، کلاسیں خالی ہیں، شیشے دروازوں کے چکنا چور، کچھ کلاسوں کے اندر، کچھ باہر بہاؤ میں کھڑے ہے پڑتے ہیں۔ لڑکے نداروں کیاں گئے سب لڑکے معلوم ہوا کہ سب کے سب نظرے رکھاتے توڑ پھوڑ کرستے کالج سے نکل کیاں آگے جا چکے ہیں۔ اپنے کمرے میں گبا، بیٹھا، یاد کیا تھا اُسے کیا لیکچر دینا تھا؟ مگر اب اسے کون سا لیکچر دینا تھا۔ بلا وجہ بلا سبب دراز کھل کر کچھ کاغذ الٹ پڑت کئے، میز پر لگی کتابیں اور ہر اور ہر سے کھول کر دیکھیں، پھر پندرا کمرے کے رکھ دیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ کھر سے وہ یادوں سے شاداب چلا تھا، اپنے آپ میں مگن، باہر سے یہ تعلق سکھ بیان نہیں پہنچتے پہنچتے باہر کی دنیا میں پھر سے مفہوم پیدا ہوتا چلا گیا۔ اب اس کے لئے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اس فرصت اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر آرام سے پیٹھی، سکھ بیٹ سلکاتے اور یادوں کی دنیا میں کھو جاتے۔ کالج کا نقشہ درہم پر تم دیکھ کر اسے خفغان سا ہو رہا تھا۔ پھر کیا کیا جائے؟ اچھا شیراز میں چلتے ہیں۔ ممکن ہے چوکڑی ججی ہو۔ عرفان کو تو پھر صورت اس وقت وہاں ہونا چل ہیتے۔ اُنھوں کھڑا ہوا۔

مھوڑتے وقت کے بعد وہ شیراز میں تھا اور عرفان سے لاز و نیاز کی ہاتین کر رہا تھا۔

عرفان جیران تھا!

”آخر کون بھتی وہ؟“

”بس بھتی وہ۔“

”وہ اس سے پہلے تو تم نے اس کا ذکر کبھی کیا نہیں تھا؟“

”میں تو اس سے چھوٹ ہی لگا تھا۔ مگر کیا کہتا۔“

” بھولی گیا تھا؟ ” عرفان نے اُسے تعجب سے دیکھا۔

” ہاں پار بھولی ہی گیا تھا۔ دن بھی تو بہت ہو گئے۔ ”

” پھر اب کیسے یاد آگئی؟ ”

” یہ ہماری یادوں کی والپی کاموسم ہے۔ جلئے کب کب کی بھولی باتیں یاد آتی ہیں۔ ”

” اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے؟ ” رکا، پھر لولا۔

” ہاں اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے۔ ” رکا، پھر لولا۔

” معلوم ہے آج کل ہماری امی کا کیا مشغله ہے؟ روز صحیح اخبار آتے پر سوال

کرتی ہیں کہ ڈھاکہ کے لئے کیا لکھا ہے۔ تمہیں پتہ ہے ناکہ ہمارے کچھ

عزیز ڈھاکہ میں آباد ہوتے تھے؟ ہماری خالہ جان۔ قوامی پرلیشیاں ہی تی

ہیں اور روز صحیح کو اخبار آتے پر سوال کرتی ہیں کہ ڈھاکہ کے لئے کیا لکھا ہے؟

اور جب انہیں کوئی تشقی بخش جواب نہیں ملتا تو انہیں یاد آتا ہے کہ یہاں

آنے پر انہوں نے خالہ جان کو خط لکھا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ ادھر اللہ یاں

کے سچھواڑے مت جانا، ادھر آ جاؤ اور پھر انہیں بھرت کے وقت کے

بھولے بسرے قستے یاد آتے لگتے ہیں۔ ”

” تو وہ ڈھاکہ میں ہے؟ ” عرفان نے قیافہ لٹایا۔

” نہیں، وہ تو پاکستان آئی ہی نہیں تھی۔ ”

” پاکستان نہیں آئی تھی؟ اچھا! ” وہ سوچ میں پڑ گیا۔

” اور تم تب سے ہندوستان نہیں لگتے؟ ”

” نہیں۔ ”

” پھر تو واقعی بہت زمانہ گز ریگا۔ ”

” یہی میں سوچ رہا ہوں۔ ” اس کی آواز دھیمی موتی جلی گئی۔ ” بہت زمانہ گز ریگا۔ ”

”جلوس آرہا ہے۔“ ایک بدحواس ٹولی نے داخل ہوتے ہوئے بخردی۔

”جلوس؟“ مختلف میزوں پر بیٹھے ہوؤں کے کام کھڑے ہوتے۔

”دہاں، بہت بڑا جلوس ہے۔ توڑ پھوڑ کر تاچلا آرہا ہے۔“

”اچھا؟“

شیراز میں بیٹھے ہوتے سب ہی لوگ گھیر گئے تھے۔ کئی ایک اٹھے اور تیزی سے باہر تسلک گئے۔ عبدال تیر کے موافق کچن سے نکلا جلدی جلدی دروازہ بند کیا اور شیشوں پر پردے کھینچ دینے۔

”آج کچھ زیادہ ہی گھر بڑا نظر آتی ہے۔“ عرفان بڑا بڑا۔

”ویسے کل کی افواہ تو غلط نہیں۔“

”گھر کل تو وہ لوگوں کے لئے سچ تھی۔“

”میں کل تو وہ بالکل سچ نظر آ رہی تھی۔“

”خبر اور افواہ دونوں کی عمر ایک دن ہوتی ہے۔ دوسرے دن یہ جانتے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ خیر نہیں، افواہ تھی یا وہ افواہ نہیں خیر تھی؟“

سلامت اور اجمل کچن کے راستے اندر داخل ہوتے۔ سلامت نے غصب ناک نظر میں چاروں طرف ڈالیں اور انگشت شہادت چاروں طرف گھماتے ہوئے اور یعنی آغاز میں کہا:

”میں پوچھتا ہوں کہ دروازہ کیوں بند ہے اور پردے کیوں پڑے ہوئے میں اور اندر ھیرا کیوں ہے؟“

عرفان تے گھوڑے کے سلامت کو دیکھا اور سرفہری سے کہا:

”اس لئے کہ باہر شود بہت ہے۔“

سلامت نے عرفان اور اسے دونوں کو غصب ناک نظروں سے دیکھا۔

”اور اس لمحے کے تم عوام کی آواز نہیں سنتا چاہتے۔ مگر سامر ارجی دلبو! یہ آواز اب نہیں دیب سکتی۔ وہ پروں کو چیر کر کر آئے گی اور تمہارے کانوں کے پروں کو پھاڑ دے گی،“

پھر اُس نے آواز دی:

”عیدل!“

عیدل تیزی سے کچن سے نکل کر آیا۔

”ملاں جی!“

”عیدل! دروازہ کھول دو اور یہ پر دہ پٹا دو۔“

”اور باہر سے روشنی اور ہوا آئے دو۔ روشنی، ہوا اور عوام کی آواز۔“، اجمل نے نایندی لجھے میں اضافہ کیا۔

”دروازہ مت کھولو۔ جلوس ہست بھرا ہوا ہے۔“، دور کی ایک میز سے آوازانی۔  
سلامت نے لال پیلے ہو کر کہا:

”وہ عوام یہں جو سرمایہ داروں اور سامر ارجی پھٹوں کے خلاف بھرے ہوئے ہیں۔“

سلامت اور اجمل دونوں اسی میز پر بیٹھ گئے جس پر وہ اور عرفان بیٹھتے۔  
سفید سر والا آدمی کہ دیر سے اکیلا بیٹھا چلتے پنی رہا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا، قریب تک آیا اور بولا: ”آپ پڑھے لکھے نوجوان ہیں پچھ بتائیتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔“

سلامت نے اسے حقارت سے دیکھا اور کہا:

”وہ ہو رہا ہے جو ہونا چاہیتے۔“

سفید سر والا آدمی سلامت کامنہ نکلتے رکا۔ پھر ٹھنڈا سالش بھرا:

”اللَّهُمَّ پُرِّ رَحْمَمْ كرے۔“، اور واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

”یا میں یہ محسوس کرتا ہوں۔“ سلامت بولا۔“ یہ سفید سروالا آدمی بیرے سفید سروالے باپ سے بھی زیادہ جاہل ہے۔“  
”میرا باپ،“ اجمل بولا۔“ تیرے سفید سروالے باپ اور اس سفید سروالے آدمی دونوں سے زیادہ جاہل ہے۔“

”مگر میرا باپ، میرا باپ نہیں ہے۔“ سلامت تے دانت پچھاتئے میں حرام زادہ ہوں۔“  
اجمل نے اعلان کیا:

”میں اپنے باپ کو اپنا باپ مانتے سے انکاری ہوں۔“  
”یا ہمارے مکروہ بیلوں نے ہمیں یہ باد کہہ ڈالا۔“ سلامت کی آواز میں یہ کایک رفت پیدا ہو گئی۔

اجمل نے عرفان کو اور بھروسے دیکھا:  
”تم دونوں بھی تو کچھ بولو۔“  
سلامت کو بھر غصہ آگیا:

”یہ دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ چپا رہ کر اپنے مکروہ بیلوں کے ناجائز بیلوں کو وقت کی زد سے بچائیں گے۔“ میرا پہ مکاراہ ایسا ہمیں ہو سکتا۔“

”سلامت صاحب آپ یہاں بیٹھئے ہیں۔“ ایک آشنا شخص کچن کی راہ سے داخل ہوتے ہوئے بولا: ”وہاں گول مارکیٹ میں شراب کی دوکان لٹ رہی ہے۔“  
اجمل نے چونک کر دیکھا ”لاقعی؟“

”ہاں جی، ہم ابھی ادھر سے ہی آ رہے ہیں۔ شراب نالیوں میں بہہ رہی ہے۔ اور کتنے بیوش پڑے ہیں۔“

”پھر بھوک ہو گئی۔“ اجل متساقاتہ بڑا بڑا۔ پھر اس نے سلامت کو محظو کا:

”یار چلیں۔ ورا دیکھیں تو سی۔“

”کہاں چلیں؟ کیا دیکھیں؟“ سلامت نے جتنا کہ کہا:

”کتوں کو یہ ہوش دیکھنے کے لئے شراب کی لٹی ہوتی دفکان کے آس پاس جانا ضروری نہیں ہے۔ کون سی نالی ہے جہاں کتنے بیوش پڑے دکھاتی نہیں دیتے۔“

پھر اس نے انگارے بر ساتی ہوتی نظر وں سے اردوگہ دکی میز وں کا جائزہ لیا اور پیغام کہلپلا:

”کتو! تمہیں اب ہوش میں آتا ہوگا۔ حساب کا وقت آ گیا ہے، حساب دینا ہوگا تمہیں بخشے، سیب کو۔“

”سوائے مہے۔“ افضل نے اطمینان سے کہ جوا بھی ابھی داخل ہوا تھا اور سلامت کو گر جستے دیکھ کر تمیل کے قریب آ گر خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ کمر سی حصیب کہ سلامت کے سامنے بیٹھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ٹوالتے ہوئے بولنا۔ ”چو ہے! تو دم پر کیوں لکھ ٹلا ہے، حساب تو مجھے لینا ہے۔ بس مجھے بالسری کا انتظار ہے۔“

”بالسری کا اور شر کے جلے مکا۔“ سلامت نے عصس سے کہا۔

”شروع جل رہا ہے۔“ افضل نے آنکھیں بند کیں، پھر کھوٹیں اور بولا جیسے کسی وسری دینا سے بول رہا ہو۔ ”چو ہو! اُندر واس دن سے جب میں بالسری کے ساتھ یہاں آؤں گا۔“

میں آؤں گا اور تمہیں حکم دوں گا کہ سنو، بالسری کیا کہتی ہے۔ میں تمہیں حکم دوں گا کہ چوہو میر سے پیچے چلو۔ تم بلوں سے نکلو گے اور میر سے پیچے چلو گے۔ جھنگی کہ میں سمندر پر پہنچ جاؤں گا اور میں سمندر کو حکم دوں گا کہ سمندر! ان چوہوں کو لے لے، اور سمندر تم سب چوہوں کو ایک سالس میں پیچے آتا رہے گا۔»

«بیواس۔» سلامت پھینپھتا یا۔

دیار یہاں وقت خاتم کرنے سے کیا فائدہ؟ آؤ گوں ما رکیٹ چلتے ہیں۔» اجمل نے سلامت کلایا زو پکڑا اور نسلکیا۔

وہ سلامت مکروہ آدمی ہے۔» افضل بیٹھ رہا یا۔

«را اور اجمل بھی، اور وہ بغل پیچہ زوار بھی جو افسوس میں کمزید کمر وہ ہو گیتا ہے۔ یہ پورا قبیلہ مکروہ لوگوں کا ہے۔»

افضال رکا، ذاکر اور عرفان کو دیکھا جو چبپڈیٹھے تھے۔

«یا ر تم دوا پیچے آدمی ہو، خوبصورت آدمی۔ خوبصورتی دنیا میں کتنی کم ہو گئی ہے ایک بیں اور دو تھی صرف تین خوبصورت آدمی۔»

«ان تین بیں سے میرا نام خارج کندو۔» عرفان نے پیزاری کے لیے میں کہا۔

«پچھنچتا ہے گا۔» افضل نے عرفان کو غصیل نظر دی سے دیکھا۔

وہ پیچھے پتہ ہے کہ اس فہرست میں ابھی بہت اضافہ ہوتا ہے۔ «عرفان نے نہ بھرے لیجے میں کہا۔

افضال نے اُس سے گھور کے دیکھا عبدال محنت میز وں کا جائزہ لیتا ہوا یہاں پہنچا۔

افضال کو دیکھا اور مودیا نہ بولا؛

«افضال صاحب! آپ آگئے چلتے لاوں؟»

«نہیں۔»